بناتے تھے۔ صبح سوئمنگ پھر ورزش پھر گٹار کے سبق، شام کو فرنچ کی کلاسیں رائڈنگ وغیرہ تمام دوستوں کے ساتھ فرداً فرداً سچ کا رشتہ ماں باپ کی عزت، بہن بھائیوں سے محبت، رشتہ داروں کا پاس۔ ۔ ۔ ۔

ایف۔ اے کے امتحانوں سے پہلے اسے نہ دوسروں سے اتنی توقعات تھیں نہ ہی وہ اپنے وجود کو اس قدر گانٹھ کر رکھتا تھا لیکن امتحانوں کے دنوں میں اس نے بڑی محنت کی پرچے اچھے ہوئے اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ اور مواخذہ کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ محاسبہ چاہے کسی غیر کا ہو یا اپنا ہو ہمیشہ کڑا ہوتا ہے۔ اس میں چونی دونی کی چھوٹ نہیں ملتی۔

اس محاسبے تلے وہ بہت جلد کثیر المقاصد ہوتا چلا گیا لیکن ایف اے پاس تھا اس لیے اُسے علم نہ ہو سکا کہ فوارے کی طرح وہ بہت سے چھیدوں میں سے نکل کر پھوار تو بن سکتا ہے آبشار کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تمام تجارتوں کا گیدڑ بننے کی خاطر اسے اپنا سونا، کھانا پینا، آرام گپ بازی ترک کرنا پڑتی تو اندر عاجز آجانے کا خیال ابھرتا اسے لگتا جیسے وہ کسی مبہم سے عارضے میں مبتلا ہے لیکن اس نے اپنے آپ سے ایسی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ اپنے بنائے ہوئے ضابطے سے باہر نکلنا اس کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

ایک روز وہ الکٹرونک کی ہابی میں مشغول اپنے اردگرد بہت سے سرکٹوں کے کاغذ جیسی تاریں گتے کا دیا پھیلائے بیٹھا تھا کہ ماموں آگئے۔ ماموں خوش زبان، متوسط طبقے کے کچھ بے فکرے کچھ ذمے دار آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی کائنات اس قدر نہیں پھیلا رکھی تھی کہ اس کے نیچے انہیں خوف آنے لگے۔

"مچھلی کا شکار کھیلنے جا رہے ہیں، چلو گے؟"

"کہاں ماموں ــــ میں یہ چھوٹا سا سرکٹ مکمل کر لوں۔"

ماموں آرام سے کرسی میں بیٹھ گئے۔

"ذی شان!"

"جی ماموں۔"

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"باوجود کہ تمہارے ابو امی نے تم پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ تم میں ایک اچھے انسان بننے کی تمام خوبیاں اور خرابیاں موجود ہیں۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"بات یہ ہے بیٹا ACTIVITY بہت اچھی چیز ہے لیکن کثیر المقاصد انسان اتنا ہی پراگندہ ہو جاتا ہے جس قدر سست الوجود کام سے نفرت کرنے والا پوستی ——— اپنے آپ کو کہیں دھجیوں میں نہ بانٹ دینا ——— سالم رہنا ——— سالم۔"

وہ ماموں کی بات بالکل نہ سمجھتا تھا پھر بھی اس نے سوال کیا۔ "وہ کیسے ماموں آج کی زندگی میں سالم کیسے رہا جا سکتا ہے۔"

"بس خواہشات کا جنگل نہ پالو ——— آرزو کا ایک پودا ہو تو آدمی منزل تک بھی پہنچتا ہے اور بکھرتا بھی نہیں۔"

ذی شان چونکہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا اور انسان جو بھی سیکھتا ہے یا تو ذاتی لگن سے سیکھتا ہے یا اپنے تجربے کی روشنی میں خوف سے سیکھتا ہے۔ اس لیے تجربے کی کمی کے باعث ذی شان کو ماموں کی باتیں کتابی لگتیں۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ماموں متوسط طبقے کا آدمی تھا۔ اس کی قمیض کے کالر پہ ہلکی سی میل ہوتی۔ ماموں کا رہن سہن معمولی تھا۔ ایسے لوگوں کی باتیں سنی تو جا سکتی ہیں لیکن ان کی سچائی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

ذی شان کے لیے زندگی ایک دوڑ کی شکل اختیار کرتی گئی۔ ایسی دوڑ جو سیدھی

نہیں تھی۔ کئی راستوں، کئی پگڈنڈیوں، کئی سرنگوں میں سے ہو کر نکلتی تھی۔ اپنی دستار بندی میں وہ اتنا مشغول تھا کہ اسے علم نہ ہو سکا کہ کب اس نے اکنامکس کا ایم۔ اے کر لیا۔ کس وقت وہ اعلےٰ قسم کا ڈی بیٹر بھی ہو گیا۔ اُسے ڈراموں میں بھی ٹرافیاں مل گئیں فوٹو گرافی کے مقابلوں میں بھی اس کی تصویروں کو انعام ملنے لگا۔ کھیلوں میں بھی اس کا نام بولنے لگا۔ مختلف رسالوں میں اس کی نظمیں بھی چھپ چھپا کر قابلِ ذکر کہلانے لگیں۔ دو ایک اخباروں میں خصوصی نمایندہ بنے رہنے کی وجہ سے اس کی جنرل نالج شہری واقعات کے متعلق بہت بھرپور ہو گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ ان چار سالوں میں اس نے تین چار ادھورے پورے عشق بھی کیے۔ ان محبتوں کا اس کی ذات پر گہرا اثر نہ ہو سکا کیونکہ جن لڑکیوں سے اس نے محبت کی تھی اُن کے بھی عشق کے علاوہ کئی مشاغل تھے۔ وہ بھی کثیر المقاصد تھیں اور پرانے زمانے کی محبوباؤں کی طرح نہ تو ہار سنگار ہی کو اپنا شعار سمجھتی تھیں نہ ہی اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑی رہتی تھیں — انہیں بھی کالج جانا ہوتا۔ شاپنگ کے لیے وقت نکالنا پڑتا۔ بیوٹی پارلروں سے فیشن کرانے ہوتے۔ سہیلیوں مرجانیوں کا دل رکھنے کو لمبے لمبے فون کرنے ہوتے۔ پھر سوشل لائف تھی۔ کچھ ان کے والدین کی کچھ ان کی اپنی — کچھ خواب تھے شادی کے، کچھ خواب تھے CAREER کے — ان لڑکیوں کے ساتھ جو معاشقے ہوئے ان میں زیادہ وقت فون پر گزرا یا پھر اچھے ہوٹلوں میں جہاں زبان کے لطف کے ساتھ ساتھ اچھی خوشبوؤں، خوبصورت لباسوں کی چمک کے اردگرد دشنبوں میں ایک دوسرے کے ٹیسٹ پر اعتراضات کے ساتھ ساتھ لڑائیاں بھی ہوئیں — اچھی، پیاری پیاری باتیں بھی کی گئیں — اور آخر میں دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو الوداع بھی کہا گیا۔

یہ شکم سیر قسم کے عشق نہیں تھے جو دُکھ یا سُکھ کی آخری سرحدوں کو چھُوا کرتے

ہیں۔ یہ کُورا کشتی سے مشابہ تھے کہ خوب دھپ دھپیا کے بعد اکھاڑے سے برلف میں پسینے میں شرابور نقلی زخموں سے چُور نکلے اور اپنے اپنے راستے پہ یوں چل دیے جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

ان ہی دنوں جب اس کی شادی کی باتیں کامن ٹاپک تھیں۔ رشتے بھی آ رہے تھے اور آفیئر بھی چل رہے تھے، اس کی پھوپھی زاد بہن کا رشتہ بھی آیا۔ پھوپھی عرصہ سے بیمار تھیں۔ وہ اپنے سسرال میں رچ بس گئی تھیں لیکن ذی شان کی لیاقتوں کے شُہرے سن کر وہ بھی امیدوار تھیں کہ ان کی آرا کا کچھ جوڑ توڑ ذی شان سے ہو جائے۔ نام تو پھوپھی زاد کا پتہ نہیں نسرین آرا تھا یا شمیم آرا یا جہاں آرا تھا لیکن بلاتے سبھی اُسے آرلد تھے۔ ذی شان کو یہ دھان پان سی لڑکی شروع سے ہی لکڑی چیرنے والا آرا ہی لگی۔

آرا بالکل ماڈرن تھی۔ سطحی طور پہ دلچسپ اور اندر سے ٹھس سی لڑکی — وہ میک اپ کپڑے، بی اے کی ڈگری، بیوٹی پارلر، وی سی آر پر دیکھی ہوئی فلموں کا ملغوبہ تھی — دو چار ملاقاتوں کے بعد کُھلتا کہ اس کی پسند ناپسند کچھ ذاتی نہ تھی بلکہ فلم ایکٹرسوں، شاعروں ادیبوں اور کرکٹروں کے انٹرویو پڑھ پڑھ کر مرتب کی گئی تھی۔ ایسے ہی اس کے کچھ نظریات تھے جو ہرگز کسی ذاتی کاوش یا تدبر کا نتیجہ نہ تھے بلکہ بڑوں کی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر اخذ کیے گئے تھے — وہ دیکھنے، سننے اور برتنے میں بڑی جاذب تھی لیکن کچھ ملاقاتوں کے بعد اس روغنی ہانڈی کا اصلی پن ظاہر ہونے لگتا اور لوگ اسے پریشر ککر کے زمانے میں بالکل ویسے ہی بھولتے جیسے وہ روغنی ہانڈی کو بھولتے ہیں۔

ذی شان کو آرا میں واقعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن کچھ ملاقاتیں دلچسپ رہیں اور پھر بخار ٹوٹ گیا۔ ان ہی دنوں وہ دو چار نوکریوں کے لیے بھی کوشش کر رہا تھا۔ اباجی کی وہ زمین جو واہگے کے قریب تھی اس کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ پھر دو لڑکیاں اور بھی تھیں جن کو کبھی کبھی ڈرائیو پہ لے جانا، ہوٹل میں ٹریٹ دینا اس کا

سر درد تھا۔

ان مشاغل کے علاوہ اس کی امی کی صحت بھی گر رہی تھی اور انہیں جملہ ڈاکٹروں کو دکھانا، دوائیاں لانا، ٹسٹ ایکسرے کرانا، امی کی دلجوئی اور رشتہ دار خواتین کو بیماری کی تفصیلات مہیا کرنا، اس کے مشاغل تھے۔ ان مشاغل کے علاوہ اسے وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ کرکٹ میچ اور وڈیو فلموں کو دیکھنے کے لیے جب اسے وقت نکالنا پڑتا تو کبھی کبھی بڑی الجھن کا سامنا ہوتا۔

ایسے ہی وقت میں جب وہ وی سی آر پر ایک دھماکے دار مار دھاڑ کی فلم دیکھ رہا تھا اور اس کی امی نے فون پہ اپنی نند کو جواب دے دیا تھا تو آرا دان کے گھر آئی۔ — ذی شان کی تمام تر توجہ اس وقت فلم میں تھی لیکن آرا روٹی ہوئی لگتی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئی اور چپ چاپ مار دھاڑ کی فلم دیکھنے لگی۔

ذی شان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی امی اس رشتے کے لیے انکار کر چکی ہیں۔ اگر اسے معلوم بھی ہوتا تو بھی کچھ اتنی زیادہ حسرت اس کے دل میں جگہ نہ پاتی۔ وہ کبھی کبھی تکلف کے ساتھ آرا کو مسکرا کر دیکھ لیتا اور پھر فلم دیکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ آرا کی حالت اس سے مختلف تھی۔ وہ اندر ہی اندر کچھ جملے بنا سنوار رہی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ بتانے پر آمادہ تھی۔

جب فلم میں وقفے کے بعد چند اشتہار آنے شروع ہو گئے تو ذی شان نے فراخدلی سے پوچھا:

"کیا حال ہیں؟"

"آپ کو معلوم ہوگا۔ کیا حال ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں خیر تو ہے بڑی مایوس سی لگتی ہو۔"

آرا کی جانب سے بڑا لمبا خاموشی کا وقفہ آگیا جس وقفے میں ذی شان نے اپنے

اندر ہی اندر آنے والے چار گھنٹوں کا پروگرام مرتب کیا اور وہ روٹ بنایا جس پر کار لے جانے سے اسے دوہرے تہرے پھیرے پڑنے کا احتمال نہ تھا۔

"مامی جی نے تو انکار کر دیا ہے آج صبح"

وہ چند لمحے سمجھ نہ سکا کہ کس لیے کس کو اور کس بات سے مامی جی نے انکار کر دیا ہے۔

"آپ کو تو شاید کچھ فرق نہ پڑے"۔

اب بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی۔

"آرا — دیکھو میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا — یہ بہتر ہے کہ اب میں تمہیں چھوٹا سا زخم دوں بہ نسبت یہ کہ بعد میں تمہیں — ساری عمر تکلیف دیتا رہوں — ابھی میں SETTLE ہونا نہیں چاہتا۔ میں ابھی طے نہیں کر سکا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کدھر اور کس کے ساتھ جانا چاہتا ہوں"۔

آرا یقیناً ایک ماڈرن لڑکی تھی لیکن ماڈرن لڑکیوں کے بھی کئی گریڈ ہوتے ہیں اور اس کا گریڈ چپراسیوں کا ساتھا جو انکار سن کر زیادہ اصرار نہیں کر سکتے۔ وہ اٹھی — اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اس نے دو قدم ذی شان کی جانب بڑھائے اور کہا:

"ذی شان — تمہاری ACTIVITIES زیادہ ہیں۔ اتنے مشاغل ہوں تو آدمی بٹا رہتا ہے۔ کبھی کبھی خالی بیٹھ کر اپنے ساتھ بھی وقت گزارا کرو — کافی دھند چھٹ جاتی ہے اور دور تک نظر آنے لگتا ہے — پھر فیصلے اپنے بھی ہوتے ہیں اور آسان بھی —"

ذی شان نے آرا کی بات پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آرا زیادہ تر باتیں نامور ادیبوں کے اقتباسات یاد کر کے کرتی ہے۔

آرا اس کی زندگی سے نکل گئی۔ غالباً وہ کبھی آئی ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اس کی

شادی ہوگئی اور شادی کے بعد مشاغل میں اور اضافہ ہوگیا۔
اس کی بیوی ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خود ساختہ لاڈلی تھی۔ وہ بھی ایک متمول خاندان کا پڑھا لکھا خوبصورت فرد تھا۔
کبھی سسر کی گاڑی، کبھی باپ کی کار، کبھی اپنی کبھی بیوی عائکہ کی گاڑی میں کئی جگہوں پر جانا پڑتا۔ کہیں کام، کہیں تفریح ــــ لیکن ہل جل آنا جانا سمیٹنا پھیلانا اس قدر تھا کہ فرصت کے لمحات سکڑتے گئے اور وہ اپنے آپ سے کبھی نہ مل سکا۔
ایک بات طے پاگئی کہ پاکستان میں رہ کر خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہاں وسائل و مواقع کی بڑی کمی ہے۔ یہ نہیں کہ ذی شان کو مالی طور پر کسی ترقی کی ضرورت تھی لیکن زندگی جمود کا نام بھی تو نہیں ہوسکتا۔
پاکستان میں ذی شان اور عائکہ کی زندگی ایک روٹین کا شکار ہوچکی تھی اور اتنے سارے مشاغل کی پیروی نے انہیں چڑچڑی بلی کی طرح ہر کھمبے کو نوچنا سکھا دیا تھا۔
جب بھی انہیں فرصت کا کچھ وقت ملتا وہ ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طور کی شکایت ہی کرتے۔ کبھی تمام الجھنوں کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ٹریفک ٹھیک نہیں۔ یہاں کا تعلیمی نظام پس ماندہ ہے۔ تمام سسٹم کام نہیں کرتے۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ پھر خاندان والے بے جا مداخلت کرتے ہیں۔ شخصی آزادی کا نام و نشان کہیں نہیں۔ دوست ریاکار منافق ہیں ــــ اصلی رشتوں کی پہچان گم ہوگئی ہے۔ نقلی رشتے بہت زیادہ ہیں ــــ؟
دفتروں میں گپ بازی فائل سسٹم بہت زیادہ ہے۔ بیوروکریٹ کی سرداری ہے ماں باپ مشفق کم ہیں، مطالباتی زیادہ ہیں۔ بہن بھائیوں کی اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ وہ اپنے اپنے مدار پر ہیں۔ غرضیکہ جب ذی شان اور عائکہ کو پاکستان سے اور پاکستان میں بسنے والوں سے اتنی شکایات ہوگئیں کہ انہیں ان شکایات کا کوئی حل نہ مل سکا تو انھوں نے اپنی بیقراری

کا حل صرف یہی سوچا کہ وہ لندن چلے جائیں اور وہاں قسمت آزمائیں۔

لندن جانے سے پہلے ایک روز وہ پھوپھی جان سے ملنے بھی گیا۔ آراد ایک کند قینچی سے گلاب کا پھول کاٹ کر اپنی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ وہ ذی شان سے ایسے ملی جیسے ان دونوں کے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں لیکن جب ذی شان چلنے لگا تو آراد کچھ چپ سی ہو گئی۔

"واپس کب آؤ گے؟"

"بس آتا جاتا رہوں گا۔"

"اچھا؟" آراد نے سوالیہ نظروں کے ساتھ پوچھا۔

"بھئی آتا جاتا رہوں گا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ امی ابو سے ملنے تو آؤں گا ہی۔"

"کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی مل لینا ذی شان — تنہائی میں — جو شخص اپنے ساتھ نہیں رہ سکتا وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔"

ذی شان نے آراد کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ آراد ایسی باتیں اقتباسات سے اخذ کر کے بولا کرتی تھی اس لیے اس نے جب آراد کو خدا حافظ کہا تو ساتھ ہی اس کی بات کو بھی بھلا دیا۔

اس کے بعد پورے بیس سال تک اس کی ملاقات اپنے آپ سے نہ ہو سکی۔

لندن کی زندگی میں مشغول اور بھی گوناگوں ہو گئے۔ پاکستان میں مالی، باورچی، دھوبی، جمعدارنی ایسے بہت سے وافر لوگ موجود تھے جو اس کی گھریلو زندگی کو سہل بناتے تھے۔ لندن میں یہ گھریلو کام بھی ان دونوں پر آ پڑے۔ عائشہ اور وہ دونوں کام کرتے تھے۔ دونوں مل کر کھانا پکاتے تھے۔ دونوں مل کر صفائی کرتے تھے۔ دونوں مل کر بچے پالتے تھے۔ دونوں تمام چھٹیاں یورپ میں گزارتے تھے۔ چھٹیوں کا پروگرام بنانا —

سستے ٹکٹوں کی تلاش ـــ سستے ہوٹلوں کا سراغ ـــ اَن گنت مصروفیات تھیں۔
گھر سے کام ـــ کام سے گھر ـــ پھر گھر پہ گھریلو کام!
اس کی زندگی مکمل طور پر اپنی ضروریات، اپنے پیشے کی ضروریات، اپنے خاندان کی کفالت کی نذر ہو گئی اور بیس سال بعد اسے پتہ چلا کہ وہ اندر سے بکھر چکا ہے ـــ تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر واپس پاکستان چلا جائے گا۔
عائکہ اس تبدیلی پر رضامند نہ تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ پاکستان میں اسے اپنے ہاتھ سے اپنے ذاتی کام کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔ مغرب میں رہنا اس نے اس لیے پسند کیا تھا کہ یہاں ذی شان اس کا گھریلو ملازم تھا۔ وہی GROCERIES لاتا، کار چلاتا، تمام بل ادا کرتا، چونکہ ان کے فلیٹ میں لفٹ عموماً خراب رہتی تھی اسلیے تیسری منزل پر تمام بھاری سامان اٹھا کر لے جانا بھی ذی شان کی شاندار ڈیوٹی تھی۔
مغرب میں کھاتے پیتے گھرانوں کے ایسے لڑکوں کے لیے مشکل زندگی تھی جو عیاش نہ تھے۔ پاکستان میں کوٹھی، کار، ملازم تمام چیزیں مہیا تھیں اور ان کے لیے کوئی جد و جہد یا تگ و دو کرنا نہ پڑتی تھی۔
ذی شان کے لیے مغرب کی زندگی ایک بڑی بیکار جد و جہد کا نام تھا۔ لمبی روٹین جس میں چھٹیاں بھی معمولات کے تحت آتیں لیکن عائکہ پاکستان واپس نہ جانا چاہتی تھی وہ مغربی طرزِ معاشرت میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی آزادی، ایک چھوٹا سا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس مقام اور آزادی کے لیے اُسے بہت محنت کرنا پڑی تھی لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔
جب ذی شان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان واپس جا کر بزنس کے امکانات دیکھے گا تو عائکہ اور بچے پیچھے رہ گئے اور اس سفر کے دوران اسے دوبئی ایئرپورٹ پر آرام ملی ـــ وہ ان بیس سالوں میں بھاری ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر بڑی شانتی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں کسی قسم کے گلے یا شکایتیں نہ تھیں۔ وہ دونوں ڈیوٹی فری شاپ پر سینٹ دیکھ رہے تھے جب اچانک ان کی نظریں ملیں۔

"ارے تم آرام!"

"ہائے ذی شان تم تو موٹے ہو رہے ہو اور بال بھی گرے کر لیے ہیں"

بڑی مدت کے بعد ملنے سے جو تپاک کی فضا پیدا ہوئی، اس کے تحت وہ دونوں لاؤنج میں ان ڈور پلانٹس میں گھری ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"امریکہ ــــ اور تم ذی شان؟"

"میں وطن ــــ پاکستان"

"امریکہ میں رہتی ہو؟" ــــ بڑی لمبی خاموشی کے بعد ذی شان نے سوال کیا۔ اسے کچھ دھندلا سا یاد تھا کہ آرام کا شوہر شکاگو میں کیش اینڈ کیری کا بزنس کرتا ہے۔

"ہاں"

"خوش ہو؟ امریکہ میں؟"

"ہاں ــــ جس قدر خوشی ممکن ہے" آرام نے آہستہ سے کہا اور پھر چند ثانیے رک کر بولی:

"اور تم ــــ تم خوش ہو لندن میں؟"

"پتہ نہیں..... میں کچھ کہہ نہیں سکتا ــــ مجھے لگتا ہے جیسے میری زندگی روٹین کی نذر ہو گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی دھجیوں میں بکھر گئی ہے ــــ اچھا کھانا، صاف ستھرے گھر میں رہنا، اچھے بازاروں میں گھومنا ــــ ہر وقت صفائی کا خیال رکھنا ــــ زندگی کیا یہی کچھ ہے؟ اس کے کیا یہی معنی ہیں؟"

آرام مسکراتی رہی۔

"عائشہ بھی کام ہی کرتی رہی ہے۔ میں بھی الجھا ہی رہا ہوں کاموں میں۔ حالانکہ اپنے وطن میں ہمیں سب کچھ میسّر تھا — اور اس کے بدلے مجھے کیا ملا ہے؟ — اونچا معیارِ زندگی! — لیکن معیارِ زندگی ہے کیا چیز؟ — اور جو کچھ مجھے ملا ہے، اس کے عوض میں اندر سے اس قدر کیوں بکھر گیا ہوں آراء — تم نے بھی تو ساری عمر امریکہ میں گزاری ہے۔ کیا تم بھی اپنی زندگی کو اتنا بے معنی سمجھتی ہو — کیا تم بھی بکھری ہو اندر سے؟"

"نہیں۔"

"پر میں — میں کیوں اتنا کھوکھلا ہو گیا ہوں؟"

"اس لیے کہ تم کثیر المقاصد تھے ذی شان — ایک وقت میں کئی آرزوئیں پال کر جینے والا ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا ہو گا؟"

"اور تم — تم بھی تو اس بے ہودہ دور کی پیداوار ہو، جب آرزوئیں ہر صبح گرمتے کے کھیت کی طرح اُگتی ہیں۔ تم نے اپنے آپ کو کیسے بچایا؟"

"اندر والے کو تو اندر ہی سے بچایا جا سکتا ہے ذی شان!"

"پر کیسے؟ — کیسے؟"

"میں نے ساری عمر ایک ارمان پالا — اور اندر صرف اس کو سینچا۔ اس کی خاطر جیتی رہی — باقی ساری ACTIVITY تو فروعی تھی — جب خواہش ایک ہو اور اس کی سمت دیکھتے رہیں تو باقی بھاگ دوڑ اندر اثر نہیں کرتی۔"

"وہ ارمان — پورا ہو گیا تمہارا؟"

"نہیں — لیکن خواہش پوری ہو نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ خواہش ایک ہی رہے — ایک وقت میں تو انتشار پیدا نہیں ہوتا — توڑ پھوڑ نہیں ہوتی۔"

ذی شان نے تعجب سے آراء کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے سوال کیا:

"اور وہ خواہش — وہ ارمان کیا تھا؟ — کیا میں پوچھ سکتا ہوں!"

آرار نے چند ثانیے ذی شان کو دیکھا جیسے بیس سال پیچھے لوٹ گئی ہو۔ ہلکا سا مسکرائی اور ڈیوٹی فری شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

"ذی شان! اگر تمہیں بھی معلوم نہیں تو بتانے سے فائدہ — اور پھر میں سوچتی ہوں ارمان تو سینٹ کی بند شیشی کی طرح ہوتا ہے۔ اظہار ہو جائے تو خوشبو اڑ جاتی ہے۔ خواہش باقی نہیں رہتی۔"

آرار ڈیوٹی فری شاپ میں اس طرح داخل ہو گئی جیسے جھومتی جھامتی ہتھنی سندر بن میں غائب ہو جائے۔

ذی شان سوچتا رہا کہ اس آخری عمر میں — اتنے انتشار کے باوجود وہ کس اکلوتی خواہش کے دھاگے میں اپنی تسبیح کے دانے پرو سکتا ہے؟

خورد سال

گرم کپڑوں کا ٹرنک بند کرنے کے بعد اس کا جی سردیوں کی آمد سے دو سار گیا۔ ابھی پچھلے سال بچوں کے کپڑوں پہ پوری تنخواہ قضا کر گئی تھی۔ اب کے جو دھپ لگوانے کو سویٹریں کوٹ نکالے تو بڑے سے بڑا کپڑا چھوٹے سے چھوٹے بچے پر اس طرح کس کر چڑھا کہ بے چارہ انگریزی کا "ٹی" بن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سردی تھی کہ تر پال اوڑھے برآمدے میں کھڑی مسلسل گھنٹی بجائے جا رہی تھی اِدھر دل میں جو نائیلون زری کی قمیض بنانے کی حسرت تھی اسے ایک بار پھر سوتی زنبیل میں رکھ کر عابدہ نے اپنا پلاسٹک کا تھیلا اٹھایا۔ پرانے سیاہ برقعے کو اوڑھا اور پرس میں دس روپے ڈال کر سپڑ سپڑ کرتی چلی۔

لوگوں کے پاس تو جانے کس زمانے کے دینارِ سرخ پڑے تھے کہ سردی کے باوجود بازاروں میں ناچتے پھر رہے تھے۔۔۔ بوائی پھٹے پیروں کو پائنچوں میں چھپا کر چلتی وہ سنگھاڑے والے کے پاس جا کر رک گئی۔ سیاہ جلد چیر کر بادام کی سی رنگت والی گریاں اُسے بڑی بدعت پر اُکسا رہی تھیں۔

بالکل ایسی ہی رُت تھی۔ اسی طرح کے دن تھے۔ عین مین اسی طرح کا سنگھاڑے والا

اُن دنوں گھر کی طرف آیا کرتا تھا لیکن وہ تو بہت دنوں کی بات تھی۔ وہ پرانے پرس کو سینے سے لگا کر آگے گلی کی طرف مڑ گئی۔

نانک چندی اینٹوں کا راستہ گھِس پس کر کسی بڈھے پھونس کی ہڈیوں جیسا چکیلا ہو رہا تھا۔ سامنے چھوٹی چھوٹی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان دکانوں کے سامنے نائیلون کے رنگین دوپٹے دائیں بائیں، چھتوں پہ سوتی و گرم شالیں اور سفید مارکین کے پھاؤ پر مختلف ملوں کی فلالین اور پرنٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ دکان دار اور عورتیں اپنے اپنے داؤ پر ایک دوسرے سے نبٹ رہے تھے۔ جو عورتیں دکانوں سے بچ کر نکل جاتیں انہیں دکاندار بہت دیر تک باجی جی، آپا جی کی صدائیں دے دے کر بلاتے رہتے۔

ریشمی کپڑوں کے رنگ اور ان کی چمک مدار کی بڑھیا بن کر بار بار عابدہ کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ نہ جانے ان ریشمی کپڑوں کو خریدنے والیاں کیسے مواخذہ بری خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ دکاندار بے دریغ تھانوں کے تھان گزوں میں ناپتے جا رہے تھے ـــ اور پھر اچھی بھلی تنخواہ کے باوجود ہر مہینے نائیلون زری کی قمیض خوابوں کی الگنی پر ٹنگی رہ جاتی۔

منے کے پاجاموں کے لیے فلالین بہت ضروری تھی لیکن دکانداروں کی شہ زوری سے کہیں بھی بھاؤ نہ بنا۔

فلالین کا ارادہ چھوڑ کر وہ جمیلہ کا سویٹر بننے کی نیت سے جنرل مرچنٹوں کی دکانوں پر رُکنے لگی۔

بچوں کی بلیٹیں، لمبے لمبے پاؤڈر کے ڈبے، روغنی کاغذوں میں لپیٹے ہوئے صابن، چابی سے چلنے والے کھلونے، بیٹری میں ڈالنے والے سیل، کوئی ایک ضرورت تو تھی نہیں۔ روپے روپے کی دو دو بنیانیں بیچنے والا بغیر لاؤڈ سپیکر کے سارے

بازار کو اپنے مال کی طرف یوں بُلا رہا تھا گویا روزِ آخر سے ڈرا رہا ہو۔

کچھ دکانوں پر تو اس نے اُون اس لیے نہ خریدا کہ وہاں کچھ اتنے زیادہ رنگ نہیں تھے۔ کچھ دکانیں اس لیے نہ پسند آئیں کہ دکاندار کا لہجہ تیزابی تھا۔ کچھ جگہ پھر فلالین کی طرح بھاؤ نہ بنا۔ ایک دو دکاندار اُسے دیر تک آپا جی آپا جی کہہ کر بلاتے رہے لیکن اُن کی دکان پر وہ اس لیے نہ ٹھہری کہ جو خود دُبلا رہے ہیں ان کا سودا ضرور ناقص ہو گا۔

ایک جگہ اون بھی سستا تھا۔ رنگ بھی اتفاقاً ہلکا مہندی سا بڑا ہی پیارا مل گیا دکاندار بھی خویش برادری کا لگتا تھا۔ پر اُسی وقت عابدہ کو خیال آیا کہ جمیلہ کی تو اگلے مہینے سالگرہ ہے۔ اس کے جو تحفے اکٹھے ہوں گے ان میں شاید کچھ سویٹر بھی ہوں منّے کے پاؤں میں جُوتی نہیں۔ اوپر سے ساس صاحبہ صبح صبح سارے کمروں میں ٹاٹ پھروا دیتی ہیں۔ فرش باسی مُولی کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ منّے کا جُوتا پہلے اور باقی چیزیں بہت بعد میں۔ وہ نہ ہو کہ خُسر میاں اٹھیں اور ادھوڑی کی گھٹیلی جوتی بچّے کے پاؤں میں لا ڈالیں۔ پھر ساری سردیاں مروّت میں وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور پاؤں میں گھٹے پڑ جائیں۔

پلاسٹک کے نیم شفاف تھیلوں میں رنگ برنگی چپلیاں کئی گھٹیل دکاندار فٹ پاتھ پر سجائے بیٹھے تھے۔ خالہ سکینہ یہیں سے کاسنی رنگ کی چپلی لے کر گئی ہو گی۔ قیمت تو سوا تین روپے نکلی لیکن خالہ اُس روز ویل کم والے تکیے پر کس ٹھسّے کے ساتھ چپلیوں سمیت بیٹھ گئی تھیں جیسے مُجرا لینے آئی ہوں، کچھ ہتیا خرید لیں۔ فوراً ڈبکی چال عابدہ کے ہاں پہنچی تھیں۔ پھر ساس سے لے کر چھوٹی نند اور جمیلہ تک کو بار بار اپنی خرید دکھاتیں۔ ادھر عابدہ کے منہ پر چھپکا پڑ جاتا۔ بے چاری مسکراتی حالت میں ٹُک ٹُک دیکھے جاتی۔

منے کی کالی اور سفید ٹمی سی پوپی ڈھائی روپے میں آتی تھی لیکن پھر عابدہ نے سوچا کہ ایک بار دس روپے کا نوٹ بھنوا لیا تو بچوں کے کنٹھے بن کر اسی بازار کی نالیوں میں کھو جائے گا۔ اسی خیال سے نہ تو پھر اس نے گنڈیریاں خریدیں نہ مونگ پھلی نہ چلغوزے والوں کی طرف دیکھا اور نہ ہی بچوں کے لیے چپس کے پیکٹ لیے۔

جب بھی پچھلے دنوں ساس صاحبہ کلیجی پکاتیں، بساندھی سی خوشبو سے عابدہ کو ابکائی آنے لگتی۔ کتنے دنوں سے خیال تھا کہ اس بار قصوری میتھی کے دو چار پیکٹ ضرور لے آئے گی۔ شوربے کے لیے پیالے درکار تھے لیکن دو چار دکانوں پر گجراتی مٹی کے کٹورے اور رکابیاں ٹھنکا کر دیکھ لینے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یہ دس روپے بچوں کی امانت ہیں۔ ان میں سے نہ تو قصوری میتھی آئے گی نہ پیالے رکابیاں اور پھر دس روپے تڑوا لیے تو بس گئے۔

گھر پہنچی تو سارے بچے ململ کے کُرتے پہنے آنگن میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ساس صاحبہ ساگ کی ہنڈیا چڑھائے پیڑھی میں سمائی پرانی سویٹر ادھیڑ رہی تھیں اس نے پٹے کے ہاتھ چلا کر سارے بچوں کو کُرتے بدلنے کا آرڈر دیا۔

منا بیچارہ ننگے پیروں دھاگے میں ایک تن تنہا بٹن پروئے سیڑھیوں پہ بغیر پاجامے کے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر "اماں — اماں —" کہہ کر لپکا اور پلاسٹک کے لفافے سے لپٹ گیا۔

ساس نے ٹھنسی لگی آواز میں پوچھا:

"بڑی دیر لگا دی بازار میں — فلالین لے آئیں؟"

"دام ٹھیک نہیں تھے اماں — اے ہے برقعہ تو اتار لینے دو —" اس نے ٹھنک سے منے کا سر ٹھونک کر کہا۔

"پھر کیا لائی ہو خرید کر —؟" انھوں نے خالی پلاسٹک کے تھیلے کی طرف

دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ــــ قیمتیں بہت چڑھ گئی ہیں چیزوں کی۔"

جمیلہ نے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ "اماں! ــــ چار آنے دو۔ لہسن اور مرچیں لانی ہیں۔"

"میرے پاس کھلا نہیں۔ دس کا ایک نوٹ ہے۔"

"اچھا۔ دس ہی دے دو ــــ" ساس نے کہا۔ "میں خود ہی جاتی ہوں۔ لہسن اور مرچیں بھی لے آؤں گی اور اپنے برقعے کی سلائی بھی دے آؤں گی۔ مہینے بھر سے درزی کے پاس پڑا ہے۔"

عابدہ نے پرس کھول کر اندر دیکھا۔

دس روپے کا ٹھٹھرا ہوا نوٹ باہیں اور ٹانگیں سمیٹے پلاسٹک کے ٹھنڈے پرس میں لیٹا تھا ــــ اپنے اسی خورد سال بچے کو جس طرح وہ بازار کی ساری آفتوں سے بچا کر گھر لائی تھی، اب اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا تھا۔

عابدہ کو اس طرح ایک دم پریشان ہوتے دیکھ کر ساس نے پوچھا:

"کیا ہوا بہو! ــــ"

عابدہ نے مسکرا کر کہا ــــ "سارا دن پھرنے کی وجہ سے چکر سا آگیا ہے خالہ!"

اور پھر ــــ

اس نے وہ خورد سال لاشہ خاموشی سے خالہ کے حوالے کر دیا۔

گاڑی دھچکا کھا کر رکی لیکن اگر گاڑی یوں نہ بھی رکتی تو بھی میں جاگ پڑتی کیونکہ بڑی دیر سے مجھے لگ رہا تھا کوئی کنکھجورا میری گردن پر ہولے ہولے رینگ رہا ہے۔ ابھی وہ میرے منہ پر آجائے گا اور اپنے سو پیروں ایسے پاؤں میری آنکھوں میں گاڑ دے گا۔

باہر پھیکی چاندنی میں ایک کالا بدہیئت انجن سیاہ چمک دار ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کر رہا ہے۔ اندر ہمارے ڈبے میں ایک سیٹ پر امی، ایک پر بڑی آپا اور ایک پر زینب آپا ایرانی بلیوں کی طرح سو رہی ہیں۔ غسل خانے کی بتی امی کے بڑے ٹرنک پر روشنی کا گول سفید دھبہ ڈال رہی ہے۔ اوپر لٹکے پنکھے چھت سے چمٹے گھوں گھوں کرتے اِدھر اُدھر چہرے گھما رہے ہیں۔ سارے ڈبے میں باسی پانی اور تازہ سانسوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ وہ رسالے بھی سیٹ سے کھسک کر فرش پہ پھیل گئے ہیں جن کے سہارے یہ سفر کٹ جانے کی امید تھی ۔۔۔ اگر مجھے باجی سے آنکھیں ملانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بھی زینب آپا، بڑی آپا اور امی کی طرح ردی ردی ہی سو جاتی۔

لیکن آج مجھے باجی ڈرا رہی ہیں۔ عرصۂ دراز پہلے ایک دن انھوں نے کچھ کہے بغیر مجھے ڈرا دیا تھا۔ امی نے نعمت خانے میں ان کے لیے مٹھائی رکھ کر تالا لگایا تھا۔ پھر وہ

چابیاں تخت پر رکھ کر نماز پڑھنے لگی تھیں تو میں نے چابیوں کا گچھا اٹھالیا اور دبے پاؤں نعمت خانے تک جا پہنچی۔ گرمیوں کی خاموش دوپہر تھی۔ میرے ادرامی کے سوائے سب سو رہے تھے لیکن اس کے باوجود میں ڈرتے ڈرتے نعمت خانے کے تالے کو چابی سے کھول رہی تھی۔ جب بڑی ہمت کے بعد میں نے پلیٹ نعمت خانہ سے نکالی تو باجی آگئیں۔ میں نے پلیٹ میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا تھا لیکن باجی نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چور بنا دیا۔

یہ باجی کا مقدر رہے کہ انہیں ہمیشہ سے اچھی چیزیں ملتی ہیں۔ امی مٹھائی کا حصہ رکھیں گی تو باجی کے لیے زیادہ رکھیں گی۔ گھر پر کپڑا آئے گا تو باجی اپنی پسند کا اٹھا لیں گی۔ پکچر جانا ہوگا تو جس فلم کا نام باجی لیں گی سبھی وہی دیکھیں گے۔ اور تو اور دولہا ملنے میں بھی باجی کا مقدر اپنی بڑی دو بہنوں پر سبقت لے گیا۔ بڑی آپا اور زینب آپا کے دولھے تو ایسے تھے ـــــ خیر جیسے آدمی ہوتے ہیں لیکن باجی کا دولھا ـــ

اس دن میں نے آنگن دھویا تھا۔ پائنچے بھیگ گئے تھے اور ہاتھوں میں خالی بالٹی تھی۔ سر اٹھا کر میں نے دیکھا، ایئر فورس کی وردی پہنے سنہری مونچھوں والا باوا سامنے کھڑا تھا ـــــ لمحے بھر کے لیے میرا دل دھڑکتا دھڑکتا رک گیا۔ جیسے خواب میں سے اٹھ کر کسی نے تھپڑ مارا ہو۔ پھر سنہری مونچھوں والے باوے نے ہنس کر مجھ سے بالٹی لے لی ـــ اور پوچھا:

"کہاں رکھنا ہے اسے؟"

زینب آپا اور بڑی آپا کے شوہروں سے کتنی مختلف بات تھی۔ ان کے سامنے سارے گھر کی چارپائیاں اندر باہر کرتے سانس پھول جاتی لیکن وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے سگریٹیں پیتے رہتے۔

جب ولایتی باوا تانگے سے اپنا سامان اتروا رہا تھا تو اندر باہر ایک طوفان سا آ گیا۔

سوائے باجی کے سبھی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے اور جس لاتعلقی سے وہ بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی تھیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ دراصل باوے کا سب سے زیادہ تعلق انھیں سے ہے پتہ نہیں کیوں، اسی روز مجھے باجی سے سخت چڑ پیدا ہو گئی۔

باجی کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ خواہ مخواہ چڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ بس چھوٹی سی بات میں ایسا الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں کہ رونے کو جی چاہتا ہے۔

ہم چاروں بہنیں بیٹھی نئے باوے کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ زینب آپا بولیں:

"سب کچھ اچھا ہے، ویسے تو یوسف کا سب کچھ اچھا ہے اک ذرا مجھے آنکھیں ناپسند ہیں۔"

مجھے پتہ نہیں ان کی بات سُن کر کیوں غصہ آ گیا، جھٹ بولی:

"کیوں۔ ان کی آنکھوں کا رنگ تو اس قدر خوبصورت ہے جیسے نیلے نیلے کنچے۔"

باجی نے ہنس کر پوچھا۔ "اور تمہیں نیلے کنچے پسند ہیں کیا؟"

میری ناک پر پسینہ آ گیا — میں جھلا کر بولی۔ "ہاں۔ کیوں نہیں؟"

اب باجی کو چڑانے کی سوجھی۔ میرے کندھے پکڑ کر جھلانے لگیں پھر اپنے مخصوص انداز میں لب اٹھا کر بار بار دوہراتی گئیں:

"کیوں تمہارا کروا دیں بیاہ یوسف سے؟ — بولو جی تہمینہ — بولو جی!"

اس سے پہلے کئی بار باجی نے مجھے چڑایا تھا لیکن میں روئی نہ تھی۔ اس دن میں نے کندھے جھٹک دیے اور رونے لگی۔ آنسو تھے کہ آپ ہی آپ آنکھوں میں آ رہے تھے اور گرتے جا رہے تھے۔ بڑی آپا نے گلے سے لگا کر کہا:

"ارے رونے لگیں — یہ باجی تو پگلی ہے تہمینہ — اس کے کہنے سے کوئی تیری شادی تھوڑی ہو چلی ہے یوسف سے۔"

پھر وہ باجی کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ "خوشی سے لڈو اپنے دل میں پھوٹ رہے ہیں